تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

حمد وصلوٰۃ اور تمہیدی فقروں کے بعد:

"رفقاء و حاضرین! جیسا کہ آپکو معلوم ہے، ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہیکہ فساق وفجار کی امامت وقیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی وجہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے افسوس ہیکہ آج اسکی اہمیت سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں، مسلمان اسکو محض ایک سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور انکو کچھ احساس نہیں ہیکہ دین میں اسکی کیا اہمیت ہے، غیر مسلم کچھ تعصب کی بناء پر اور کچھ ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں کہ دراصل فساق وفجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے، اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہیکہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو، آج دنیا جو فساد عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے انسانی اخلاق میں جو عالمگیر بگاڑ رونما ہے، انسانی تمدن اور تہذیب اور معیشت وسیاست کی رگ رگ میں جو زہر سرایت کر گیا ہے، زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں جس طرح انسان کی فلاح و بہبود کے بجائے اسکی تباہی کیلئے استعمال ہو رہی ہیں، اس سب کی ذمہ داری اگر کسی چیز پر ہے تو وہ صرف یہی ہیکہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی کمی نہ ہو مگر دنیا کے معاملات ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں بلکہ خدا سے پھرے ہوئے، اور مادہ پرستی اور بد اخلاقی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو اصلاح سے اضطراب کو امن سے، بد اخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کیلئے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسکا فرض ہیکہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اسکو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کا نظام میں تغیر کیا جا سکے۔

زمام کار کی اہمیت

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی بصیرت بھی حاصل ہو گی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہیکہ معاملات انسانی کا زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اسے لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھتے ہوں خواستہ اور ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کیلئے مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں، ظاہر ہیکہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت واقتدار کی باگیں جن کے ہاتھ میں ہوں، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات وافکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کا تعین جن کے اختیار میں ہو، انکی راہنمائی وفرمانروائی

کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں، یہ راہ نماو فرمانبروائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں یہ راہ نماو فرماص روااگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر وصلاح پر چلے گا۔ برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلائیوں کونشوونما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم ازکم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر راہ نمائی وقیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق وفجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بد اخلاقی پر چلے گا خیالات ونظریات، علوم وآداب، سیاست ومعیشت، تہذیب ومعاشرت، اخلاق ومعاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے، برائیاں خوب نشونما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی انکو غذا دینے سے انکار کر دیں گے اور خدا کی زمین ظلم وجور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چلنا آسان اور بھلائی کی راہ پر چلنا کیا معنی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے، جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجمع جس طرف جا رہا ہو اس طرف چلنے کیلئے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن اگر اسکی مخالف سمت میں کوئی چلنا چاہے تو بہت زور مار کر بھی بمشکل ایک آدھ قدم چل سکتا ہے اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے، اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر وفسق کی راہوں پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گرہوں کیلئے غلط راہ پر چلنا تو اتنا آسان ہو جاتا ہیکہ انہیں بطور خود اس پر چلنے کیلئے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن اگر وہ اسکے خلاف چلنا چاہیں تو اپنے جسم و جانکا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہ راست پر بڑھ سکتے ہیں اور اجتماعی رو انکی مزاحمت کے باوجود انہیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹا لے جاتی ہے۔

یہ بات جو عرض کر رہا ہوں یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کیلئے دلائل کی ضرورت ہو، بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدہ وبینا انکار نہیں کر سکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات ونظریات بدلے ہیں، مذاق اور مزاج بدلے ہیں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بدلے ہیں تہذیب واخلاق کے معیار اور قدر وقیمت کے پیمانے بدلے ہیں، زندگی کے طریقے اور معاملات کے ڈھنگ بدلے ہیں اور کون سی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو، یہ سارا تغیر جو دیکھتے دیکھتے آپ کی اس سرزمین میں ہوا اسکی اصلی وجہ کیا ہے؟ کیا آپ اسکی وجہ اسکےسوا کچھ اور بتلا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی اور راہ نمائی وفرمانروائی کی باگوں پر جن کا قبضہ تھا انہوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفسیات، معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو انکی اپنی پسند کے مطابق تھا؟ پھر جن طاقتوں نے اس تغیر کی مخالفت کی، ذرا ناپ کر دیکھئے کہ انہیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہیکہ کل جو مزاحمت کی تحریک کے پیشوا تھے آج انکی اولاد وقت کی رو میں بہی چلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہیکہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اٹھ رہے ہیں جنہیں خدا کے وجود اور وحی ورسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہیکہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کن مسئلہ زمام کار کا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلہ نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اسکی یہی اہمیت رہی ہے۔ الناس علے دین ملوکھم بڑا پرانا مقولہ ہے اور اسی بناء پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور امراء کو قرار دیا گیا ہے کیوں کہ لیڈر شپ اور زمام کار ان ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

امامت صالحہ قیام دین کا حقیقی مقصود ہے

اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیکہ دین میں اس مسئلہ کی کیا اہمیت ہے؟ ظاہر بات ہیکہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہیکہ لوگ بالکلیہ بندہ حق بن کر رہیں اور انکی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور بندگی کا حلقہ نہ ہو پھر وہ یہ چاہتا ہیکہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اسکا مطالبہ یہ ہیکہ زمین سے فساد مٹے اور ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں اور ان خیرات وحسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، ان تمام مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہوسکتا کہ نوع انسانی کی راہ نمائی وقیادت اور معاملات انسانی کی سربراہ کاری ائمہ کفر وضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو محض ان کے ماتحت رہ کر انکی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے ہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہم خیر وصلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں اجتماعی قوت پیدا کریں اور سردھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت وراہنمائی اور قیادت وفرماں روائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہو ہی نہیں سکتا جو دین کا اصل مدعا ہے۔ اسی لئے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا ہو پہنچ سکے۔ غور کیجئے! آخر قرآن وحدیث میں التزام جماعت اور سمع وطاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہیکہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرے تو وہ واجب القتل ہو جاتا ہے، خواہ وہ کلمہ توحید کا قائل ہو اور روزہ نماز کا پابند ہی کیوں نہ ہو۔ کیا اسکی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہیکہ امامت صالحہ اور نظام حق کا قیام وبقا دین کا حقیقی مقصود ہے اور مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے۔ لہٰذا جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جسکی تلافی نہ نماز سے ہوسکتی ہے اور نہ اقرار توحید سے؟ پھر دیکھئے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہیکہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے۔ جہاد نظام حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔ اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس دل میں ایمان نہ ہوگا وہ تو نظام باطل کے تسلط پر راضی ہوسکتا ہے اور نہ نظام حق کے قیام کی جدوجہد میں جان ومال سے دریغ کرسکتا ہے اور اگر کوئی اس معاملہ میں کمزوری دکھاتا ہے تو اسکا ایمان ہی مشتبہ ہے۔ پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچاسکتا ہے؟ اس وقت اتنا موقع نہیں ہیکہ میں آپ کے سامنے اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کرو، مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کیلئے بالکل کافی ہیکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے امامت صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، اور جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اسکا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہوجاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے بلکہ عین اسکیا یمانکا تقاضہ یہ ہیکہ وہ اپنی تمام سعی وجہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کردے کہ زمام کار فساق وفجار کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظام حق قائم ہو جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اس لئے ایک ایسی جماعت صالحہ کا وجود ضروری ہے جو خود اصول حق کی پابند ہو اور نظام حق کو قائم کرنے باقی رکھنے اور ٹھیک چلانے کے سوا دنیا میں کوئی دوسری غرض پیش نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہو تب بھی اس کیلئے یہ درست نہیں ہیکہ اپنے آپ کو اکیلا پاکر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظام باطل کے تسلط پر راضی ہوجائے یا ''اھون البلیتین'' کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبہ کفر وفسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کردے بلکہ اس کیلئے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہیکہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔ پھر اگر کوئی اسکی بات سن کر نہ دے تو اسکی ساری عمر

صراط مستقیم پر کھڑے ہوکر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مرجانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہےکہ۔ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو ضلالت میں بھٹکی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں اور ان راہوں پر چل پڑے جن کفار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو اور اگر کچھ اللہ کے بندے اسکی بات سننے پر آمادہ ہوجائیں تو اس کیلئے لازم ہےکہ۔ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کیلئے جدوجہد کرنے میں صرف کردے جس کا میں ذکر کررہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن وحدیث کا مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضہ یہی کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتاب الٰہی کا مطالبہ ہے یہی انبیاء کی سنت ہے اور میں اپنی اس رائے سے نہیں ہٹ سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر یہ ثابت نہ کردے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے۔

امامت کے باب میں خدا کی سنت

اپنی سعی کے اس مقصود ومنتہا کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اس سنت اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جس کے تحت ہم اپنے اس مقصود کو پاسکتے ہیں۔ یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں اسکو اللہ تعالیٰ نے ایک قانون پر بنایا ہے اور اسکی ہر چیز ایک لگے بندھے ضابطہ پر چل رہی ہے۔ یہاں کوئی سعی محض پاکیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بناء پر کامیاب نہیں ہوسکتی اور نہ محض نفوس قدسیہ کی برکتیں ہی اسکو بارآور کرسکتی ہیں بلکہ اسکیان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو ایسی مساعی کی بارآوری کیلئے قانون الٰہی میں مقرر ہیں۔ آپ اگر زراعت کریں تو آپ خواہ کتنے بزرگ صفت انسان ہوں اور تسبیح وتہلیل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن آپ کا پھینکا ہوا کوئی بیج بھی برگ وبار نہیں لاسکتا جب تک آپ اپنی سعی کاشتکاری میں اس قانون کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں، جو اللہ تعالیٰ نے کھیتوں کی بارآوری کے مقرر کردیا ہے اسی طرح نظام امامت کا وہ انقلاب بھی جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے بھی محض دعاؤں اور پاک تمناؤں سے رونما ہونہ سکے گا۔ بلکہ اس کیلئے بھی ناگزیر ہےکہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اسکی ساری شرطیں پوری کریں جس کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے اور کسی ملتی ہے اور کسی سے چھنتی ہے، اگرچہ اس سے پہلے بھی اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارۃً بیان کرتا رہا ہوں لیکن آج میں اسے مزید تشریح وتفصیل کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ وہ مضمون ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہوسکتی۔

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اسکیاندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جلی بھی۔

اسکی ایک حیثیت تو یہ ہےکہ وہ اپنا ایک طبعی وحیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبیعات اور حیوانات پر فرمانروائی کررہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات ووسائل پر، ان مادی ذرائع پر اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی وحیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کرسکتا ہے قوانین طبعی کے تحت آلات ووسائل کے ذریعہ سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کرسکتا ہے۔ اور اسکیکام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اسکیانسان ہونے یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔ یہ اخلاقی وجود طبیعات کا تابع نہیں ہے بلکہ اس پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے

طبعی وحیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائیں ہیں اور اس پر فرمان روائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

انسانی عروج وزوال کا مدار اخلاق پر ہے

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اسکی کامیابی وناکامی اور اسکے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نا مادی قوت ہی سے ہوسکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت ہی سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور اگر وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اسکیہاتھ سے جاتی رہتی ہیں۔ یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہوجاتا ہے لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نا کہ مادی طاقت کی۔ اس میں شک میں نہیں کہ مادی وسائل کا اصول طبعی ذرائع کا استعمال اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کیلیئے شرط لازم ہے، اور جب تک انسان اس عالم طبعی Physical World میں رہتا ہے یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ اصل چیز جو انسانکو گراتی اور اٹھاتی ہے اور جسے اسکی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے ظاہر ہیکہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسانکو انسان کہتے ہیں وہ اسکی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اسکی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا ممیز ہوتا ہیکہ وہ یہ نہیں کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے۔ بلکہ اسکی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے وہ اسکا اخلاقی اختیار اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جوہر انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرمانرواء ہیں اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

ایک بنیادی انسانی اخلاقیات، دوسرے اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی حدود کی اساس قائم ہے۔ اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کیلیئے بہر حال شرط لازم ہے خواہ وہ صحیح مقصد کیلیئے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کیلیئے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہیکہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، طہارت نفس اور نیت خیر اور عمل صالح سے آراستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کیلیئے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کیلیئے، قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو اور اسکی زندگی پاک ہو یا ناپاک اور اسکی سعی کا مقصد اچھا ہو یا برا۔ جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہوگا جو دنیا میں کامیابی کیلیئے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اسکیمقابلہ میں ناقص ہونگے۔

مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح اور یا مفسد غرض جو بھی ہو، وہ اگر کارگر انسان ہوسکتا ہو تو صرف اسی صورت میں جب کہ اسکیاندر ارادہ کی طاقت اور فیصلہ کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ ہو، صبر اور ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور

برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی اور جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کیلئے ہر چیز قربان کردینے کا بل بوتا ہو۔حزم واحتیاط اور معاملہ فہمی اور تدبر ہو، باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ ہو۔فرض شناسی اور احساس ذمہ داری ہو ،حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر اختیار کرنے کی صلاحیت ہو اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو اور دوسرے انسانوں کو موہنے اور ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔

پھر ناگزیر ہیکہ۔وہ اسکیاندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جوہر آدمیت ہیں اور جنکی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعت قلب ونظر، سچائی، امانت، راست بازی، پاس عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی،طہارت ونظافت، اور ذہن ونفس کا انضباط۔

یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یہ سمجھے کہ اسکیپاس وہ سرمایہ انسانیت موجود ہے جس سے ایک طاقتور اجتماعیت وجود میں آسکتی ہے۔لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہوکر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اسکی مدد کو نہ آئیں۔مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی جماعتی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان اور مال اور اولاد سے عزیز تر رکھیں۔ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو انہیں مل کر کام کرنا آتا ہو وہ اپنی خودی ونفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کرسکیں جو منظم سعی کیلئے ناگزیر ہے، وہ صحیح اور غلط راہ نما میں تمیز کرسکتے ہوں اور موزوں اادمیوں کو ہی اپنا راہ نما بنائیں۔انکے راہ نما میں اخلاص اور حسن تدبیر اور راہ نمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں اور خود قوم یا جماعت اپنے راہ نماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جس کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کیلئے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں "بنیادی انسانی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں۔اور انسان اسی مقصد کیلئے بھی دنیا میں کامیاب سعی نہیں کرسکتا جب تک کہ ان اوصاف کا زور اسکیاندر موجود نہ ہو۔ان اخلاقیات کا مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی اور استحکام رکھتا ہے اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کیلئے استعمال ہو یا صحیح مقصد کیلئے۔آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہو تب بھی تو آپ کیلئے مفید وہی ہتھیار ہوسکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو نہ کہ سڑی ہوئی پھپھسی لکڑی سے۔جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لاسکتی ہو۔یہی وہ بات ہے جسے نبیؐ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہیکہ:

ترجمہ: تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں۔

یعنی زمانہ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہر قابل وہی زمانہ اسلام میں مردانہ کار ثابت ہوئے۔فرق صرف یہ ہیکہ انکی قابلتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہورہی تھی اور اسلام میں آکر انہیں صحیح راہ پر لگادیا مگر بہرحال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔نبیؐ کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گذرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصہ نے محسوس کرلئے، اسکی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کیرکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔اگر خدانخواستہ آپ کو بودے، کم ہمت اور ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر بھی نتائج نکل سکتے تھے۔

اسلامی اخلاقیات

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبہ کو لیجئے جسے میں ''اسلامی اخلاقیات'' کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسکی تصحیح اور تکمیل ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ ہیکہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز ومحور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاق مجرد ایک قوت ہیں جو خیر بھی ہوسکتی ہیں اور شر بھی۔ جس طرح تلوار کا حال ہیکہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو میں ہاتھ میں جا کر آلہ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر وسیلہ خیر بھی اسی طرح ان اخلاقیات کا بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اسکا خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو اور اسکو صحیح راہ پر لگانے کی خدمات اسلام انجام دیتا ہے اسلام کی دعوت توحید کا لازمی تقاضا یہ ہیکہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں کا اور اسکی دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ والیک نسعی ونحفد و (خدایا ہماری کوشش اور ساری دوڑ دھوپ تیری ہی خوشنودی کیلئے ہے۔) اور اسکا پورا دائرہ فکر وعمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کیلئے مقرر کردی ہیں۔ ایاک نعبد وو لک نصلی ونسجد و (خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تیرے ہی لئے نماز اور سجدہ کرتے ہیں) اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہی ہیکہ۔ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں، وہ قوت جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے بجائے اسکیہ۔ نفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سربلندی پر ہر ممکن طریقے سے صرف ہو۔ خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں ہی سے صرف ہونے لگتی ہے یہی چیز اسکو ایک مجرد قوت کے مرتبہ سے اٹھا کر ایجابا ایک بھلائی اور دنیا کیلئے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجئے بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو صبر دنیاوی اغراض کیلئے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو اسکی برداشت اور اسکی ثبات اور قرار کی بس ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اٹھتا ہے لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کیلئے نہیں بلکہ رب العالمین کیلئے ہو، وہ تحمل و برداشت اور پامردگی کا ایک اتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کے تمام مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتی۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اسکا حال یہ ہوتا ہیکہ۔ ابھی تو گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقعہ سامنے آیا تو نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلہ میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف چند مخصوص قسم کے خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلے میں نہیں بلکہ ہر اس لالچ، ہر اس خوف، ہر اس اندیشہ اور ہر اس خواہش کے مقابلے میں ٹھہراؤ کی ایک زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ در حقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول ہی یہ کہ عمر بھی صحیح طرز خیال اور صحیح طرز عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات اور مشکلات ہوں۔ اور اس دنیا کی زندگی میں اسکا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے، اور کبھی فکر وعمل کی برائی نہ اختیار کرو۔ خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوشنما سبز باغ ہمارے سامنے لہلہا رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے۔ اور اسکا ظہور لازماً ان شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانہ پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ اسی مثال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے

ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم ہی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا کام یہ ہیکہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاق فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالائی منزل تعمیر کرتا ہے جسکی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو خود غرضی سے، نفسانیت سے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے اس میں خدا ترسی تقوی پرہیزگاری اور حق پرستی پیدا کرتا ہے۔ اسکیاندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور ابھارتا ہے، اسکو ضبط نفس کا خوگر بنایا ہے، اسے تمام مخلوقات کیلئے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض، خیر خواہ، بے لوث، منصف اور ہر حال میں صادق و راست باز بنا دیتا ہے۔ اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر بلکہ حدیث رسولؐ کے لفظ میں وہ اسے مفتاح للخیر مغلاق للشر (الحدیث) یعنی بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے۔ یعنی وہ ایجاباً یہ مشن اسکیسپرد کرتا ہیکہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرتاً وہ حسن ہے وہ کشش ہے وہ بلا کی قوت تسخیر ہیکہ اگر کوئی منظم کوئی جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اس مشن کیلئے سعی کرے جو اسلام نے اسکیسپرد کرے تو اسکی جہاں گیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

سنت اللہ درباب امامت کا خلاصہ

اب میں چند الفاظ میں اس سنت اللہ کو بیان کئے دیتا ہوں جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجود فطرت پر زندہ ہے اس وقت تک برابر جاری رہے گی اور وہ یہ ہیکہ:

اگر دنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے تو دنیا کی امامت و قیادت کسی ایسے گروہ کے قبضے میں دے دی جاتی ہے جو بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالی بہر حال اپنی دنیا کا انتظام چاہتا ہے اور یہ انتظام اسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے جو موجود الوقت گروہوں میں اہل تر ہو۔

لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں کوتاہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہیکہ اسکیمقابلے میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ کی اس سنت کے خلاف ہے جو انسانوں کے معاملوں میں اس نے مقرر کر رکھی ہیں، ان وعدوں کے خلاف ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین سے کئے ہیں اور اللہ کو ہرگز یہ پسند نہیں ہیکہ اسکی دنیا میں ایک صالح گروہ انتظام عالم کو ٹھیک ٹھیک اسکی رضا کے مطابق درست رکھنے والا موجود ہو اور پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ڈور رہنے دے۔

مگر یہ خیال رہیکہ اس نتیجہ کا ظہور صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ایک جماعت صالحہ ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد کے موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کے متعلق جتنے بھی وعدے کئے ہیں منتشر و متفرق افراد سے نہیں بلکہ ایک ایسی جماعت سے ہے جو دنیا میں اپنے آپ کو عملاً خیر امت اور امت وسط ثابت کر دے۔

نیز یہ بھی ذہن نشین رہیکہ۔ ایسے ایک گروہ کے وجود میں آجانے ہی سے نظام امامت میں تغیر واقع نہیں ہو جائے گا۔ کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتہ اتریں اور فساق وفجار کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انہیں مسند نشین کر دیں۔ بلکہ اس جماعت کو کفر وفسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامت حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانی دے کر اپنی محبت حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاء تک مستثنٰی نہ رکھے گئے۔ کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنٰی ہونے کی توقع کرے۔

بنیادی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کی طاقت کا فرق

مادی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناسب کے بعد میں قرآن اور تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو سنت اللہ میں سمجھا ہوں ہو یہ ہیکہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو وہاں مادی وسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس امر کا بھی امکان ہیکہ اگر ایک گروہ کے پاس مادی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دنیا پر چھا جاتا ہے۔ اور دوسرے گروہ اخلاقی طاقت میں فائق تر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہوں وہاں مادی وسائل کی انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخر کار ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے، جو مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی سروسامان کے بل بوتے پر اٹھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھئے کہ بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوت کے ساتھ صرف پچیس درجے مادی طاقت کافی ہو جاتی ہے۔ باقی ۷۵ فیصدی قوت کی کمی کو محض اسلامی اخلاق کا زور کر دیتا ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کے عہد کا تجربہ تو یہ بتا تا ہیکہ اسلامی اخلاق اگر اس پیمانہ کا ہو جو حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فیصدی مادی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جسکی طرف آیت ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین (اگر تم میں سے ۲۰ صابر آدمی ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے۔ الانفال۔ رکوع ۹)

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اسے محض خوش عقیدگی پر محمول کیجئے اور نہ یہ گمان کیجئے کہ میں کسی معجزہ و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں نہیں، یہ بالکل فطری حقیقت ہے جو اسی عالم اسباب میں قانون علت ومعلول کے تحت پیش آتی ہے۔ اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے، اگر اسکی علت موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اسکی تشریح کردوں کہ اسلامی اخلاقیات سے جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں، مادی اسباب کی ۷۵ فیصدی تک کمی کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔

اس چیز کو سمجھنے کیلئے آپ ذرا خود اپنے زمانہ ہی کی بین الاقوامی صورتحال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ لیجئے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فساد عظیم جو آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے شروع ہوا تھا جرمنی کی شکست پر ختم ہوا ہے۔ اور جاپان کی شکست بھی قریب آرہی ہے۔ جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے ان کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمنی اور جاپان نے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علوم طبیعی اور ان کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں۔ بلکہ اس معاملہ میں کم از کم جرمنی کی فوقیت تو کسی سے مخفی نہیں ہے مگر صرف ایک چیز ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اور وہ ہے مادی اسباب کی موافقت۔ اسکیپاس آدمی اپنے دونوں حریفوں سے کئی گنے زیادہ ہیں۔ اسکیمادی وسائل انکی نسبت بدرجہا زیادہ حاصل ہیں۔ اسکی جغرافیائی پوزیشن ان سے بہتر ہے اور اسکو تاریخی اسباب نے ان کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیئے ہیں اسی وجہ سے اسکو فتح نصیب ہوئی ہے

اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کیلئے بھی جسکی تعداد کم ہو اور جسکی دسترس میں مادی وسائل کم ہوں، اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعداد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے۔ خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبیعی علوم کے استعمال میں ان سے کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لئے کہ بنیادی اور اخلاقی اور طبیعی علوم کے بل پر اٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یا تو وہ خود اپنی قومیت کی پرستار ہوگی اور دنیا کو اپنے لئے مسخر کرنا چاہے گی یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصولوں کی حامی بن کر اٹھے اور دوسری قوموں کو انکی طرف دعوت دی گی۔ پہلی صورت میں اس کیلئے کامیابی کی کوئی شکل بجز اسکے ہے ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فائق پر ہو۔ کیوں کہ وہ تمام قومیں جن پر اسکی حرص واقتدار کی زد پڑ رہی ہوگی، انتہائی غصہ ونفرت کے ساتھ اسکی مزاحمت کریں گی اور راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گی۔ رہی دوسری صورت تو اس میں بلاشبہ اسکا امکان تو ضرور ہیکہ قوموں کے دل ودماغ خود بخود اسکی اصولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور اسے مزاحمتوں کو راستے سے ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے گی لیکن یہ یاد رہنا چاہئے کہ دل صرف چند خوش آئند اصولوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انہیں مسخر کرنے کیلئے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راست بازی، بے غرضی، فراخ دلی، فیاضی، ہمدردی اور شرافت وعدالت درکار ہے جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھڑی اور بے لوث ثابت ہو، اور یہ چیز اخلاق فاضلہ کی اس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے، یہی وجہ ہیکہ مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر اٹھنے والے خواہ کھلے قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالم گیر اصولوں کی دعوت وحمایت کا ڈھونگ رچائیں، آخر کار انکی ساری حمایت اور کشمکش خالص شخصی یا طبقاتی یا قومی خود غرضی ہی پر آٹھہرتی ہے۔ جیسا کہ آج آپ امریکہ، برطانیہ اور روس کی سیاست خارجہ میں نمایاں طور دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہیکہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑی ہو جائے اور اپنی پوری اخلاقی ومادی طاقت اسکی مزاحمت میں صرف کردے اور اپنے حدود میں اسکو ہرگز راہ دینے کیلئے تیار نہ ہو جب تک کہ مخالفت کی برتر مادی طاقت اسکو پیس کر نہ رکھ دے۔

اچھا اب ذرا تصور کیجئے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابتداءً ایک ہی قوم میں اٹھا ہو، مگر "قوم" کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "جماعت" کی حیثیت سے اٹھا ہو) پایا جاتا ہے جو شخصی طبقاتی اور قومی خود غرضیوں سے پاک ہے اسکی سعی وجہد کی کوئی غرض اسکے سوا نہیں ہیکہ وہ نوع انسانی کی فلاح چند اصولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے، ان اصولوں پر جو سائٹی وہ بناتا ہے اس میں قومی ووطنی اور طبقاتی ونسلی امتیازات بالکل مفقود ہیں تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہوسکتے ہیں، اس میں رہنمائی وقیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعہ اشخاص کو حاصل ہوسکتا ہیں، اس میں رہنمائی وقیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعہ اشخاص کو حاصل ہوسکتا ہے جو ان اصولوں کی پیروی میں سب پر فوقیت لے جائے، قطع نظر اس سے کہ اسکی نسلی ووطنی قومیت کچھ ہی ہوحتی کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہیکہ اگر مفتوح ایمان لاکر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کردے تو فاتح اپنی سرفروشیوں اور جانفشانیوں کے سارے ثمرات اسکے قدموں میں لاکر رکھ دے اور اسکو امام مان کر خود مقتدی بننا قبول کرلے۔ یہ گروہ جب دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اسکے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے اسکی مزاحمت کرتے ہیں، اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے، مگر اس کش مکش میں کتنی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اتنے ہی زیادہ افضل واشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرز عمل سے ثابت کردیتا ہیکہ واقعی وہ خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا۔ اسکی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف انکی ضلالت وگمراہی سے ہے، وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو بھی سینے سے لگا سکتا ہے اور اسے لالچ ان کے مال ودولت یا انکی تجارت وصنعت کا نہیں بلکہ خود انہی کا اخلاقی وروحانی فلاح کا ہے جو حاصل

ہو جائے تو انکی دولت ان ہی کو مبارک رہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائشوں کے موقعوں پر بھی جھوٹ، دغا اور مکروفریب سے کام نہیں لیتا، ٹیڑھی چالوں کا جواب بھی سیدھی تدبیروں سے دیتا ہے۔ انتقام کے جوش میں بھی ظلم وزیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا، جنگ کے سخت لمحوں میں بھی اپنے اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا جنگی دعوت دینے کیلئے وہ اٹھا ہے سچائی، وفائے عہد اور حسن معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ بے لاگ انصاف کرتا ہے امانت و دیانت کے اس معیار پر پورا اترتا ہے جسے ابتداء اس نے دنیا کے سامنے معیاری حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری، اور سنگ دل و بے رحم فوجوں سے جب اس گروہ خدا ترس، پاک باز، عبادت گذار، نیک دل اور رحیم و کریم مجاہدوں کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرداً فرداً انکی انسانیت انکی درندگی وحیوانیت پر فائق نظر آتی ہے۔ وہ ان کے پاس زخمی وقیدی بن کر آتے ہیں تو یہاں ہر طرف نیکی، شرافت اور پاکیزگی اخلاق کا ماحول دیکھ کر انکی آلودہ نجاست روحیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں اور یہ وہاں گرفتار ہو کر جاتے ہیں تو انکا جوہر انسانیت اس تاریک ماحول میں اور زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ انکو کسی علاقہ پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتوح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوت کی جگہ ہمدردی تکبر و نخوت کی جگہ حلم و تواضع، گالیوں کی جگہ دعوت خیر جھوٹے پروپیگنڈوں کی جگہ اصول حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ ان سے عورتیں مانگتے نہ دبے چھپے مال ٹٹولتے پھرتے ہیں نہ انکی صنعتی رازوں کا سراغ لگاتے ہیں، ان انکی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں۔ نہ انکی قومی عزت کو ٹھوکر مارتے ہیں، بلکہ انہیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب ان کے چارج میں ہے اسکے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہونچے، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بداخلاقی ان کے درمیان پرورش نہ پا سکے۔ اور اجتماعی ظلم و جور کسی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے، بخلاف اسکے جب فریق مخالف کسی علاقہ میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اسکی زیادتیوں اور بے رحمیوں سے چیخ اٹھتی ہے اب آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا فرق واقع ہو جائے گا۔ ظاہر ہیکہ ایسے مقابلہ میں بالآخر انسانیت کمتر مادی سروسامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخر کار شکست دے کر رہے گی۔ اخلاق فاضلہ کے ہتھیار توپ تفنگ سے زیادہ دور مار ثابت ہوں گے عین حالت جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے، جسموں سے پہلے دل مسخر ہوں گے، آبادیوں کی آبادیاں لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہو جائیں گی۔ اور یہ صالح گروہ جب ایک مٹھی بھر جمعیت اور تھوڑے سے سروسامان کے ساتھ اپنا کام شروع کردے گا تو رفتہ رفتہ خود مخالف کیمپ ہی سے اسکو جنرل، سپاہی، ماہرین فنون، اسلحہ رسد، سامان جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ نرا قیاس اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپ کے سامنے نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت نہ ہو۔

حضرات! مجھے توقع ہیکہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن نشین ہوگئی ہوگی کہ طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے اور اگر دنیا میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو تو یہ بات عقلاً محال اور فطرۃً غیر ممکن ہیکہ اسکی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت وقیادت پر قابض رہ سکے۔ اسکیساتھ مجھے امید ہیکہ آپ نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر بات ہیکہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں نہ بنیادی اخلاقیات ہی پائے جائیں وہ کسی امامت کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے۔ خدا کی اٹل بے لاگ سنت کا تقاضہ ہی یہی ہیکہ ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے جو اسلامی اخلاقیات سے عاری سہی مگر کم از کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو ان سے بڑھے ہوئے

ہیں اور اپنے آپ کو انکی بہ نسبت نظام دنیا کے اہل تر ثابت کر رہے ہیں، اس معاملہ میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہئے اور اس شکایت کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے آپ کو امام سے مقتدی اور پیش رو سے پس رو بنا چھوڑا ہے۔

اسکے بعد ضرورت ہیکہ میں صاف اور واضح طریقہ سے آپ کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کردوں، کیوں کہ مجھے معلوم ہیکہ اس معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور اس الجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت وتکمیل کیلئے کیا چیزیں کس ترتیب وتدریج کے ساتھ اسکے اندر پرورش کی جانی چاہئیں۔

اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب

جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات سے تعبیر کرتے ہیں وہ قران وحدیث کی رو سے دراصل چار مراتب پر مشتمل ہیں، ایمان، اسلام، تقوی اور احسان۔ یہ چاروں مراتب یکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبہ سے پیدا اور لازماً اسی پر قائم ہوتا ہے اور جب تک نیچے والی منزل پختہ ومحکم نہ ہو جائے دوسری منزل کی تعمیر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمانکو بنیاد پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے پھر اسکے اوپر تقوی اور سب سے اوپر احسانکی منزلیں اٹھتی ہیں، ایمان نہ ہو تو اسلام وتقوی یا احسانکا سرے سے کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ایمان کمزور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یا ایسی کوئی منزل تعمیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور متزلزل ہوگی۔ ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہوگا اسلام تقوی اور احسان بھی بس انہیں حدود تک محدود رہیں گے۔ پس جب تک ایمان پوری صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو، کوئی مرد عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو، اسلام، تقوی کی تصحیح، پختگی اور توسیع ضروری ہے۔ لیکن اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری واصولی ترتیب کونظر انداز کر کے ایمان واسلام کی ترتیب کے بغیر تقوی اور احسانکا باتیں شروع کر دیتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہیکہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود تصور جاگزیں ہے۔ اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع قطع، لباس، نشست و برخاست، اکل وشرب اور ایسی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشہ پا ڈھالنے سے تقوی کی تکمیل ہو جاتی ہے اور پھر عبادت نوافل و اذکار اور اوظائف اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار کرلینے سے احسانکا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات اسی تقوی اور احسان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہیکہ ابھی انکا ایمان ہی سرے سے درست اور پختہ نہیں ہوا ہے۔ یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں کسی طرح امید نہیں کی جا سکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے۔ لہذا یہ ضروری ہیکہ ہمیں ایمان اسلام اور تقوا اور احسان کیان چاروں مراتب کا پورا پورا تصور بھی حاصل ہو اور اسکیساتھ ہم انکی فطری ترتیب کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

ایمان:

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ایمانکو لیجئے جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے ہر شخص جانتا ہیکہ توحید رسالت کے اقرار کا نام اسلام ہے۔ اگر کوئی شخص اسکا اقرار کرلے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے ضروری ہے، اور وہ اسکا مستحق ہو جاتا ہیکہ اسکیساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے مگر کیا یہی سادہ اقرار جو

ایک قانونی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے کافی ہے، اس غرض کیلئے بھی کافی ہوسکتا ہیکہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اسی بنیاد پر قائم ہو سکے؟ ہوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقوی اور احسان کی تعمیر شروع کردی جاتی ہے جو اکثر ہوائی قلعہ سے زیادہ پائدار ثابت نہیں ہوتی لیکن فی الواقع ایک مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کیلئے یہ ناگزیر ہیکہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گہرائی میں اچھی مستحکم ہو۔ ایمانی تفصیلات سے جو شعبہ بھی چھوٹ جائے گا اسلامی زندگی کا وہی شعبہ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا اور اسکی گہرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔

مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھئے جو دین کی اولین بنیاد ہے آپ دیکھیں گے کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گذر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو اسکی بے شمار صورتیں بن جاتی ہیں، کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہیکہ بے شک خدا موجود ہے اور وہ دنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہیکہیں اسکی انتہائی وسعت بس اتنی ہوتی ہیکہ خدا ہمارا معبود ہے اور ہمیں اسکی پرستش کت تمام جزوی صورتوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ "مذہبی معاملات" میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے۔ظاہر ہیکہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا محدود ہوگا حتی کہ جہاں عام مذہبی تصورات کا مطابق ایمان باللہ اپنی انتہائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ساتھ نباہ لی جائے، یا نظام کفر اور نظام اسلام کو سمو کر ایک مرکب بنالیا جائے۔

اسی طرح ایمان باللہ کی گہرائی کا پیمانہ بھی مختلف لوگوں میں مختلف ہے۔کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سی معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوتا۔کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز رکھتا ہے مگر بعض چیزیں اسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں کوئی اپنی جان و مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے، مگر اپنے رجحانات نفس اور اپنے نظریات و افکار کی قربانی یا اپنی شہرت کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی، ٹھیک اسی تناسب سے اسلامی زندگی کی پائیداری بھی متعین ہوتی ہے۔اور انسان کا اسلامی اخلاق ٹھیک اسی مقام پر دغا دے جاتا ہے جہاں اسکیپ ایمانی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اسی اقرار توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے، اسکو اپنا اور تمام دنیا کا ایک جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحب امر و نہی تسلیم کرے، اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے، اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف یا اسکی ہدایت سے بے نیازی یا اسکی ذات وصفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے پھر اس عمارت میں استحکام اگر پیدا ہوسکتا ہے تو صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اور اسکا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کیلئے ہے، اپنے معیار پسند و ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کرے، اپنی خودسری کو مٹانے کر اپنے نظریات، خیالات، خواہشات، جذبات اور انداز فکر کو اس علم کے مطابق ڈھال لے جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریابرد کردے جو خدا کی وفاداری کی تابع نہ ہو۔بلکہ اسکی مدمقابل بنی ہوئی ہوں یا بن سکتی ہوں اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے نہاں خانہ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلہ میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو، اپنی محبت اور نفرت اپنی دوستی اور دشمنی اور رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ اور ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کردے کہ اسکا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور اسی سے وہ بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔یہ ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ

گیری اور اپنی پختگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقوی یا احسانکا کیا امکان ہوسکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباسکی تراش خراش یا سبحہ گردانی اور تہجد خوانی سے پوری کی جاسکتی ہے؟

اسی پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسانکا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما مان لے اور اسکی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں انکو ردنہ کرے، کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصول زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو یا اتباع ما انزل اللہ کو اپنی اور ساری دنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کیلئے قلب وروح کی بے چینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلہ میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اور آخرت کی جوابدہی کا خیال اسے زندگی کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر کھٹکنے نے لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری طرح موجود نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شئے پر تعمیر ہوگی؟ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسیع وتکمیل اور پختگی کے بغیر تعمیر اخلاق انسانی کو ممکن سمجھا تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے والے جج غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمہ لڑانے والے وکیل، نظام کفر کے مطابق زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصول وتمدن وسیاست پر زندگی کی تشکیل وتاسیس کیلئے لڑانے والے لیڈر اور پیرو، غرض سب کیلئے تقوی واحسان کے مراتب عالیہ کا دروازہ کھل گیا، بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے ظاہری اندازواطوار کو ایک خاص نقشہ پر ڈھال لیں اور کچھ نوافل واذکار کی عادت ڈال لیں۔

اسلام:

ایمانکی یہ بنیادیں جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے جب مکمل اور گہری ہوجاتی ہیں تب ان پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا نام ہے ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا بیج اور درخت کا ہوتا ہے۔ بیج میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ حتی کہ درخت کا امتحان کرکے بآسانی یہ معلوم کیا جاسکتا ہیکہ بیج میں کیا تھا اور کیا نہ تھا، آپ نے یہ تصور کرسکتے ہیں کہ بیج نہ ہو اور درخت موجود ہو، اور نہ ہی یہ تصور کرسکتے ہیں کہ زمین بنجر بھی نہ ہو اور بیج اس میں موکود بھی ہو پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا معاملہ ایمان اور اسلام کا ہے جہاں ایمان موجود ہوگا لازماً اسکا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں اخلاق میں، برتاؤ میں، تعلقات کے کٹنے اور جڑنے میں، دوڑ دھوپ کے رخ میں، مذاق ومذاح کی افتاد میں، سعی وجہد کے راستوں میں، اوقات اور قوتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہر زندگی کے ہر ہر جز میں ہوکر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہورہا ہو، یقین کرلیجیے کہ اس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بسر ہورہی ہو تو جان لیجئے کہ دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بنجر ہیکہ ایمانکا بیج برگ وبار نہیں لارہا ہے۔ بہرحال میں نے جہاں تک قرآن وحدیث کو سمجھا ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہیکہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر پوچھا کہ ایمان اور عمل کو آپ ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے؟

اسکے جواب میں کہا:

آپ تھوڑی دیر کیلئے اپنے ذہن سے ان بحثوں کو نکال دیں جو فقہاء اور متکلمین نے اس مسئلہ میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہیکہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم وملزوم

ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے اور تمام اچھے وعدے جو اس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں ان ہی لوگوں سے متعلق ہیں جو اعتقاداً مومن اور عملاً مسلم ہوں، پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں ان کے عمل ہی کی خرابیوں سے ان کے ایمان کے نقص پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلامی ہی کو حقیقی ایمان کی علامت ٹھرایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو کافر ٹھرانے اور امت سے اسکا رشتہ کاٹ دینے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انتہائی احتیاط ملحوظ رہنی چاہیئے۔ مگر میں یہاں اس ایمان و اسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس پر دنیا میں فقہی احکام مرتب ہوتے ہیں بلکہ یہاں ذکر اس ایمان و اسلام کا ہے جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس پر اخروی نتائج مرتب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطہ نظر کو چھوڑ کر حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے کہ جہاں عملاً خدا کے آگے سپر اندازی اور سپردگی و حوالگی میں کمی ہے جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری کے نبھ رہی ہے جہاں اقامت دین کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انہماک ہے جہاں کوششیں اور محنتیں راہ خدا کے بجائے دوسری راہوں پر صرف ہو رہی ہیں وہاں ضرور ایمان میں نقص ہے اور ظاہر ہیکہ ناقص ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تعمیر نہیں ہو سکتی خواہ ظاہر کے اعتبار سے متقیوں کی سی وضع بنانے اور محسنین کے بعض اعمال کی نقل اتارنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو انکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسی ایک نہایت خوبصورت آدمی کی لاش بہترین وضع و ہیئت میں موجود ہو مگر اس میں جان نہ ہو اس خوب صورت لاش کی ظاہر شان سے دھوکا کھا کر آپ اگر کچھ توقعات اس سے وابستہ کرلیں گے تو واقعات کی دنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اسکا ناکارہ پن ثابت کردے گی۔ اور تجربہ سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بدصورت مگر زندہ انسان ایک خوب صورت مگر بے روح لاش سے بہر حال زیادہ کار گر ہوتا ہے ظاہر فریبوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکہ دے سکتے ہیں مگر عالم واقعہ پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میزان ہی میں کوئی وزن حاصل کرسکتے ہیں، پس اگر آپ کو ظاہری نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہو جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پلڑا جھکانے کیلئے درکار ہے تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیجیے کہ اوپر کی یہ دونوں منزلیں کبھی نہیں اٹھ سکتیں جب تک ایمانی بنیاد مضبوط نہیں ہو جائے اور اسکی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بالفعل اطاعت و فرمانبرداری سے نہ مل جائے۔

تقویٰ:

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ تقویٰ ہے کیا چیز؟ تقویٰ حقیقت میں کسی وضع و ہیئت اور کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کی اسکیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہیکہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری و جوابدہی کا احساس ہو اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مہلت عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہیکہ میں اس دیئے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کس طرح استعمال کرتا ہوں اس سرو سامان میں کس تصرف کرتا ہوں جو مشیت الٰہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کردی ہے یہ احساس و شعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اسکا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور اسکی دینی حس تیز ہو جاتی ہے اور اسکو ہر وہ چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو اسکی مذاق کو ہر وہ شئے ناگوار گذرنے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہیکہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات و میلانات پرورش پا رہے ہیں، وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہیکہ کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں، وہ

صریح ممنوعات تو درکنار مشتبہ امور میں بھی مبتلا ہوتے ہوئے خود بخود جھجھکنے لگتا ہے اسکا احساس فرض اسے مجبور کردیتا ہیکہ تمام اوامر کو پوری فرماں برداری کے ساتھ بجالائے۔ اسکی خدا ترسی ہر اس موقت پر اسکے قدم میں لرزش پیدا کردیتی ہے جہاں حدوداللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اسکا وطیرہ بن جاتی ہے۔ اور اس خیال سے بھی اسکا ضمیر کانپ اٹھتا ہیکہ کہیں اسے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہوجائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرہ عمل میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرز فکر اور اسکے تمام کارنامہ زندگی میں اسکا ظہور ہوتا ہے اور اسکے اثر سے ایک ایسی ہموار یک رنگ سیر پیدا ہوجاتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی وصفائی پائیں گے۔ بخلاف اسکے جہاں تقوی بس اس چیز کا نام رکھ لیا گیا ہیکہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کرلے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایک ایسے سانچہ میں ڈھال لے جسکی پیمائش کی جاسکتی ہو، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکال تقوی جو سکھادی گئی ہیں انکی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہورہی ہے مگر اسکے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرز فر اور وہ طرز عمل بھی ظاہر ہورہے ہیں جو مقام تقوی تو درکنار ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔ یعنی حضرت مسیحؑ کی تمثیل زبان میں مچھر چھانے جارہے ہیں اور اونٹ بے تکلفی کے ساتھ نگلے جارہے ہیں۔

حقیقی تقوی اور مصنوعی تقوی کے اس فرق کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت ونظافت کی حس موجود ہے اور پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے ایسا شخص گندگی سے فی نفسہ نفرت کرے خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو اور طہارت کو بجائے خود اختیار کرے گا خواہ اسکے مظاہرہ کا احاطہ نہ ہوسکتا ہو۔ بخلاف اسکے ایک دوسرا شخص ہے جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اسکی فہرست میں لکھی ہوئی ہیں مگر بے شمار ایسی گھناؤنی چیزوں میں آلودہ پایا جائے گا جو ان گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں گی جن سے وہ بچ رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ اسکی فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کررہا ہوں یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اسکو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقوی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیات شرع کا یہ اہتمام ہیکہ داڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کردیا جاتا ہے یا پائنچہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہوجائے جہنم کی وعید سنادی جاتی ہے۔ اور اپنے مسلک فقہی کے فروعی احکام سے ہٹنا ان کے نزدیک گویا دین سے نکل جانا ہے، لیکن دوسری طرف دین کے اصول وکلیات سے انکی غفلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہیکہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انہوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے۔ اقامت دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انہوں نے نکال رکھی ہیں، غلبہ کفر کے تحت "اسلامی زندگی" کے نقشے بنانے ہی میں انکی محبتیں اور کوششیں صرف ہورہی ہیں اور ان ہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہیکہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے بلکہ اسکی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کرکے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کرسکتے ہیں اور اس سے آگے کچھ مطلب نہیں ہے جس کیلئے وہ سعی کریں پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اسکی بات سنی ان سنی کردیتے ہیں بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اسکام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کیلئے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقوی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا ہیکہ ان کے تقوی میں کوئی کسر ہے۔ اسی طرح حقیقی اور مصنوعی تقوی کا فرق بے شمار شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے مگر آپ اسے تب ہی محسوس کرسکتے ہیں کہ تقوی کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہیکہ وضع قطع اور لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلووں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں میں انکا استخفاف کرنا چاہتا ہوں ۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہیکہ اصل شئے حقیقت تقوی ہے نہ کہ یہ مظاہر حقیقت تقوی جس کے اندر پیدا ہوگی اسکی پوری زندگی ہمواری وہ یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی اور اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اسکےخیالات میں، اسکےجذبات اور رجحانات میں، اسکےمذاق طبیعت میں اسکےاوقات کی تقسیم اور اسکی قوتوں کے مصارف میں اسکی سعی کی راہوں میں، اسکےطرز زندگی اور معاشرت میں، اسکی کمائی اور خرچ میں غرض اسکی حیات دنیوی کے سارے پہلووں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ اور حقیقی تقوی کی تخم ریزی اور آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرادی جائے گی تو وہ نتائج وہی کچھ ہونگے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزما ہے، بتدریج نشونما پائی اور ایک مدت کے بعد برگ وبار لاتی ہے جس طرح بیج سے درخت کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگاتی ہے۔ اسی لئے سطحی مزاج کے لوگ اس سے اپراتے ہیں بخلاف اسکےدوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کرلی جاتی ہے جیسے ایک لکڑی میں میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے یہی وجہ ہیکہ تقوی کی پیداوار کا یہی ڈھونگ آج مقبول ہے لیکن ظاہر ہیکہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے کبھی پوری نہیں ہوسکتیں۔

احسان:

اب احسانکو لیجئے جو اسلام کی بلندترین منزل ہے احسان دراصل اللہ اور اسکےرسول اور اسکےدین کے ساتھ اس قلبی لگاؤ اس گہری محبت اس سچی وفاداری اور فدویت وجان نثاری کا نام ہے جو مسلمانکو فنا فی الاسلام کردے، تقوی کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے جو انسانکو اسکی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسانکا اساسی تصور خدا کی محبت ہے جو آدمی کو اسکی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ابھارنے ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی وتندہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجالاتے ہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہوں، تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو حکومت کیلئے قابل اعتراض ہو، دوسرا طبقہ ان مخلص وفاداروں اور جان نثاروں کا ہوتا ہے جو دل وجان سے حکومت کے بہی خواہ ہیوتے ہیں صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو ان کے سپرد کی گئی ہوں بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ لگی رہتی ہیکہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح کوئی آنچ آئے تو وہ جان ومال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کیلئے آمادہ ہوجاتے ہیں قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو ان کے دل کو چوٹ لگتی ہیکہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہوجاتے ہیں اور اسے فرو کرنے میں جان لڑا دیتے ہیں جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اسکےمفاد کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کیلئے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا رکھتے۔ انکی دلی خواہش یہ ہوتی ہیکہ دنیا میں بس انکی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اسکا پھریرا نہ اڑے۔ ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ حکومت کے متقی ہیں اور دوسری قسم کے لوگ اسکےمحسن، اگرچہ ترقیاں متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہرحال ان کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں مگر جو سرفرازیاں محسنین کیلئے ہیں ان میں کوئی دوسرا انکا شریک نہیں ہوتا۔ بس اسی مثال پر اسلام کے متقیوں اور محسنوں کو بھی قیاس کرلیجئے اگرچہ متقین بھی قابل قدر اور قابل اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصل طاقت محسنین کا گروہ ہے اور وہ اصلی کام جو اسلام چاہتا ہیکہ دنیا میں ہو وہ اسی گروہ سے بن آسکتا ہے۔

احسانکی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ جو لگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں اور جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کردی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کردیا جائے خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اسکیباغیوں کا بول بالا ہورہا ہو، نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی وتمدنی فساد برپا ہو، بلکہ خود امت مسلمہ پر بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہورہی ہو اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو نہ اس حالت کو بدلنے کیلئے کوئی جذبہ پھڑ کے بلکہ اسکیبر عکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبہ پر اصولاً و عملاً مطمئن کردیں انکا شمار آخر محسنین میں کس طرح ہوسکتا ہے اور اس جرم عظیم کے بعد محض یہ بات انہیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کرسکتی ہیکہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے۔ حدیث وقرآن کا درس دیتے رہے، جزیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیہ نفس کی خانقاہوں میں دین داری کا فن سکھاتے رہے جس میں حدیث وفقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو سرواداند ادست درد دست یزید“ کی کیفیت پیدا کرے اور بازی اگر چہ پانہ سکا سرتو کھوسکا کے مقام وفاداری پر پہنچائے۔ آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہوجائے یا ملک کے کسی حصہ پر دشمن کا قبضہ ہوجائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جو لوگ جائز تسلیم کرلیں یا ان کے تسلط پر راضی ہوجائیں اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کرلیں یا انکی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی باگیں ان ہی کہ ہاتھ میں رہیں اور کچھ ضمنی حقوق اور اختیارات انہیں بھی مل جائیں تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتی خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزوی معاملات میں قومی قانون کتنے ہی شدید پیرو ہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہورہا ہے جنہوں نے جرمن قبضہ کے دوران تعاون ومصالحت کو راہیں اختیار کی تھی ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ ہیکہ کس شخص نے دشمن کے تسلط کی مزاحمت کس حد تک کی اسکو مٹانے کیلئے کیا کام کیا، اور اس اقتدار کو واپس لانے کی کیا کوشش کی جسکی وفاداری کا وہ مدعی تھا پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہیکہ وہ اپنے وفاداروں کو پہنچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنی دنیا کے ان کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس داڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پائچوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش، اور وظائف اور نوافل اور مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکہ کھا جائے گا کہ آپ اسکیسچے وفادار اور جان نثار ہیں؟

غلط فہمیاں

حضرت! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن میں مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات وظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہیکہ۔ دین کے اصول وکلیات ودین داری واخلاق اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے مگر لوگوں کے دماغ ہر پھر کر ان ہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جنہیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقاء اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنی پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے اور اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا ہے؟ لیکن

ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروغ کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی جن میں سارا مطالبہ بس اسکا ہیکہ جماعت کے لوگوں کی داڑھیاں بڑھوائی جائیں۔ پائنچے ٹخنوں سے اونچے کروائے جائیں اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے اسکیعلاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انہیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں مگر شاید خود نہیں بتاسکتے کہ وہ فی الواقع ہے کیا شئے۔ اس بناء پر انکی رائے یہ ہیکہ نصب العین اور طریق کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیہ نفس اور تربیت روحانی کیلئے خانقاہوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان اسلام، تقوی اور احسانکی جو تشریح کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن وحدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اسکی نشاندہی فرمادیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چاروں چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود سوچئے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقوی اور احسانکی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو وہاں آخر کون سی روحانیت پائی جاسکتی ہے۔ جسے آپ تلاش کرنے جارہے ہیں رہے وہ جزئیات شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے تو انکا حقیقی مقام میں آپکے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کئے دیتا ہوں تا کہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب پہلے ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کیلئے بھیجے ہیں؟ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی؟ کیا خرابی پائی جاتی تھی جسے رفع کرنے کیلئے انبیاء کو مبعوث کرنے ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور ان ہیکو رکھوانے کیلئے رسول بھیجے گئے؟ یا یہ کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعہ سے انہیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ سنتیں جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت اچھا ہے دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہیں کو جاری کرنے کیلئے انبیاء کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا پھر سوال یہ ہیکہ وہ اصل خرابیاں کیا تھیں جنہیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلائیاں کیا تھیں جنہیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اسکا جواب آپ اسکیسو ااور کیا دے سکتے ہیں کہ خدا کی اطاعت وبندگی سے انحراف، خود ساختہ اصول وقوانین کی پیروی اور خدا کے سامنے ذمہ داری وجوابدہی کا عدم احساس، یہ تھیں وہ اصل خرابیاں جو دنیا میں رونما ہوگئی تھیں، انہیں کی بدولت اخلاق فاسدہ پیدا ہوئے غلط اصول زندگی رائج ہوئے اور زمین میں فساد پیدا ہوئے، پھر انبیاء علیہم السلام اس غرض کیلئے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بندگی ووفاداری اور اسکیسامنے اپنی جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے۔ اخلاق فاضلہ کو نشوونما دیا جائے اور انسان زندگی کی نظام ان اصولوں پر قائم کیا جائے جن سے خیر وصلاح ابھرے اور شر فادبے۔ یہی ایک مقصد تمام انبیاء کی بعثت کا تھا اور آخر کار اسی مقصد کیلئے محمد مصطفے ﷺ مبعوث ہوئے۔

اب دیکھئے کہ اس مقصد کی تکمیل کیلئے محمد مصطفے نے کس ترتیب وتدریج کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایمانکی دعوت دی اور اسکو وسیع ترین بنیادوں میں پختہ ومستحکم فرمایا پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بتدریج اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعہ سے اہل ایمان میں عملی اطاعت وفرمانبرداری (یعنی اسلام) اخلاقی طہارت یعنی تقوی اور خدا کی گہری محبت ووفاداری (یعنی احسان) کے اوصاف پیدا کئے۔ پھر ان مخلص مومنوں کی منظم سعی وجہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو مٹانا اور اسکی جگہ قانون فطرت کے اخلاق وتمدنی اصولوں پر ایک نظام صالح قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل ودماغ، نفس واخلاق، افکار واعمال، جملہ حیثیت سے واقعی مسلم، متقی اور محسن

بن گئے اور اسکام میں لگ گئے جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہئے تھا تب آپؐ نے انکو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور دوسرے ظاہری برتاؤ میں وہ مہذب آداب واطوار کون سے ہیں جو متقیوں کو زیب دیتے ہیں، گویا، پہلے مس خام کو کندن بنایا، پھر اس پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا، پہلے سپاہی تیار کئے پھر انہیں وردی پہنائی۔ یہی کام کی صحیح ترتیب ہے۔ جو قرآن وحدیث کے غائر مطالعہ سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر اتباع سنت نام ہے اس طرز عمل کا جو نبی کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کیلئے ہدایات الٰہی کے تحت اختیار کیا تھا تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اسکی خلاف ورزی ہیکہ حقیقی مومن مسلم متقی اور محسن بنائے بغیر لوگوں کو متقیوں کے ظاہری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے، اور ان سے محسنین کے چند مشہور و مقبول عام افعال کی نقل اتروائی جائے، یہ سیسے اور تانبے کے ٹکڑوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا کر بازار میں انکو چلا دینا، اور سپاہیت وفاداری اور جان نثاری پیدا کئے بغیر نرے وردی پوش نمائشی سپاہیوں کو میدان میں لاکر کھڑا کرنا میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعلسازی ہے۔ اور اسی جعل سازی کا نتیجہ ہیکہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائشی سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معرکہ سر ہوسکتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک شخص ایمان رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاق صالحہ سے متصف ہے حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری اور جاں نثاری کا حق ادا کردیتا ہے مگر ظاہری فیشن کے اعتبار سے ناقص اور ظاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے اسکی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس یہی تو ہوگی کہ ایک اچھا ملازم ہے مگر ذرا بدتمیز ہے ممکن ہیکہ اس بدتمیزی کی وجہ سے اسکو مراتب عالیہ نصیب نہ ہوسکیں مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اسکی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا۔ اور اسکا مالک صرف اس لئے اسے جہنم میں جھونک دے گا کہ وہ خوش وضع اور خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجئے کہ ایک دوسرا شخص ہے جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آداب تہذیب کے التزام میں کمال درجہ محتاط ہے مگر اسکی وفاداری میں نقص ہے اسکی فرض شناسی میں کمی ہے اسکی غیرت ایمانی میں خامی ہے، آپ کیا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اسکی غیرت ایمانی میں خامی ہے آپ کیا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اس ظاہری کمال کی حد سے حد کتنی قدر خدا کے یہاں ہوگی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہرا اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے۔ جسے سمجھنے کیلئے کتابیں کھنگالنے کی ضرورت ہو محض عقل عام سے ہی ہر آدمی جان سکتا ہیکہ ان دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کون سی چیز ہے، دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں جو چیز قابل قدر ہے اس میں اور ضمنی خوبیوں میں فرق کرسکیں۔ یہ انگریزی حکومت آپکے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست اور ظاہری آداب واطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اسکا حال آپ کو معلوم ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسر انکی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل ودماغ اور جسم وجاں کی ساری قوتیں صرف کردے اور حملے کے وقت پر کوئی قربانی دینے سے دریغ نہ کرے وہ خواہ ان کے نقطہ نظر سے کتنا ہی اجڈ اور گنوار ہو، کئی کئی دن شیو نہ کرتا ہو، بے ڈھنگا لباس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے نابلد ہو، مگر سارے عیوب کے باوجود اسکو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور اسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے بخلاف اسکے جو شخص فیشن، تہذیب، خوش تمیزی اور سوسائٹی کے مقبول عام اطوار کا معیاری مجسمہ ہو، لیکن وفاداری وجان نثاری میں ناقص ہو اور کام کے وقت پر فرض اور تقاضائے غیرت قومی کے مقابلہ میں اپنی جان اپنی راحت اور اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کرجائے اسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکنار شاید اسکا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپکا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تانبے میں تمیز کرنے کے بجائے محض سطح پر اشرفی کا ٹھپہ دیکھ کر اشرفی کی قیمت اور پیسہ کا ٹھپہ دیکھ کر پیسے کی قیمت لگا دے گا۔؟

میری اس گذارش کو یہ معنی نہ پہنایئے کہ میں ظاہری محاسن کی نفی کرنا چاہتا ہوں یا ان احکام کی تعمیل کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح ودرستی کے متعلق دیئے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اسکا قائل ہوں کہ بندہ مومن کو ہر اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے جو خدا اور رسول نے دیا ہو اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے ظاہر اور باطن دونوں کو درست کرنا چاہتا ہے لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہیکہ مقدم چیز باطن میں حقیقت کا جوہر پیدا کرنے کی فکر کیجئے پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالئے۔ آپکو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان اوصاف کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جو اللہ کے یہاں اصلی قدر کی مستحق ہیں اور جنہیں نشونما دینا انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصلی مقصود تھا۔ ظاہر کی آراستگی اول تو ان اوصاف کے نتیجے میں فطرۃً خود ہی پیدا ہوتی چلی جائیگی۔ اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تکمیلی مراحل میں اسکا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔

دوستو اور رفیقو! میں نے بیماری اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپکے سامنے صرف اسلئے کی ہیکہ میں امر حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کب اسکی مہلت عمر ان پوری ہو، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حق پہونچانے کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اس سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر وضاحت طلب ہو تو پوچھ لیجیے، اگر میں نے کوئی بات خلاف حق بیان کی ہو تو اسکی تردید کر دیجئے۔ اور اگر میں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہونچا دیا ہے تو گواہی دیجئے۔ (آوازیں: "ہم گواہ ہیں")۔

آپ بھی گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔